محترمہ حمیدہ بیگم کے''ادب برائے نجات'' کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر امتیاز احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی وعلوم اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی لاہور

Abstract

Hameeda Begum is one of those urdu writers who devoted her life for utilizing power of pen to achieve high moral goals. Her writings inculcate patriotism, sympathy and affection for human being, initiation for reforming social, moral and religious attitudes.

ڈاکٹر اشفاق احمد ندوی نے جبران خلیل جبران کے فن اور شخصیت پر ایک تحقیقی کتاب تصنیف کی جس میں آپ نے جبران کی اس خصوصیت کو اجاگر کیا ہے کہ جبران نے اپنے افکار کو خلوص و محبت، پاکیزگیٔ ذوق، احساس کی گہرائی اور تشبیہات کی جدت کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کی تحریر زندگی کی سچی حقیقت بن گئی ہے۔ ادیب ایک حق گو انسان ہوتا ہے۔ اگر کسی ادیب کے پاس کوئی سچی اور واقعیت پر مبنی بات نہیں تو وہ ادیب ہی نہیں۔ مقرر کی تقریر خوبصورت الفاظ سے آراستہ ہونے کے باوجود اصلاحی پیغام سے عاری ہو اور وعظ کا جذبہ روح کی گہرائیوں سے نہ نکلے تو خود غرضی کا نمونہ ہیں۔[1]

ڈاکٹر اشفاق نے جبران کی تحریر کو جن خصوصیات کی بناء پر زندگی کی حقیقت قرار دیا ہے انہی خصوصیات کو محترمہ حمیدہ بیگم کے ادبی نگارشات میں بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ آپ کے الفاظ روح کی گہرائی سے بھرنے والے اس اصلاحی پیغام سے آراستہ ہیں جس کے علمبردار علامہ اقبال، حالی، ڈپٹی نذیر احمد، اکبر الہ آبادی اور علامہ راشد الخیری جیسے خیر خواہانِ ملت تھے۔ آپ ۱۹۱۴ء میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد چودھری محمد عالم محکمہ ریلوے میں ملازم تھے۔ وہ ایک بے حد محنتی، دیانتدار اور مخلص انسان تھے۔ آپ نے صالحہ بی بی گرلز سکول گوجرانوالہ سے مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں ۱۹۳۴ء میں گورنمنٹ گرلز ہائی سکول سے پنجاب یونیورسٹی کے تحت میٹرک کا امتحان دیا اور یونیورسٹی بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ بچپن سے حمیدہ بیگم بہت سنجیدہ، شریف الطبع اور غیر معمولی ذہین تھیں۔ دن کا بیشتر وقت پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ کھیلنے کودنے کی طرف میلان نہ ہونے کے برابر تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد جلد ہی بعد صالحہ بی بی گرلز سکول سے وابستہ ہو گئیں جہاں آٹھ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔

اس عرصہ میں منشی فاضل، ایف۔اے اور بی۔اے کے امتحانات پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت میں دیئے اور کامیاب رہیں۔بی ٹی کرنے کے بعد آپ کو صالحہ بی بی گرلز سکول گوجرانوالہ کی ہیڈ مسٹریس بنا دیا گیا جس کو آپ کی کوششوں سے مڈل کا درجہ حاصل ہوا۔

محکمہ تعلیم سے باقاعدہ منظوری اور سرکاری گرانٹ ملنے کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد محترمہ حمیدہ بیگم کو سکول انتظامیہ کی بعض خرابیاں نظر آئیں جو آپ کو ناگوار گزریں۔ چنانچہ ایک سال کی رخصت لے کر اپنے بھائی راجہ محمود خاں کے پاس خانیوال آ گئیں جہاں وہ ریلوے گارڈ تھے۔یہی وہ سال ہے جب محترمہ نے مولانا مودودی کی سب کتابوں کا خوب توجہ سے مطالعہ کیا،قبل ازیں مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں سے بھی استفادہ کرتی رہیں۔یہی مطالعہ آگے چل کر اس منفرد ادبی اسلوب میں ڈھل گیا جو آپ کی شناخت قرار پایا۔

قیامِ پاکستان کے بعد سیاستدانوں کی بے مقصدیت اور آپس کی سر پھٹول کے باعث اشترا کی نظریات کے حامی ادیبوں اور حامیوں نے محنت،تعلیم اور ادب کے شعبوں کو اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے ہدفِ عمل بنا لیا۔خصوصاً اشتراکیت کے علمبردار صحافیوں اور ادیبوں نے اخبارات ہفت روزہ اور ماہانہ رسائل کے ذریعے ایسے مضامین اور افسانوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جو عقائد میں تشکیک وانکار کو تحریک دینے والے تھے،اور ساتھ ہی اخلاق واقدار سے اعراض کے رویے بھی جنم لینے لگے تھے۔حمیدہ بیگم نے اس صورتحال کو تشویش سے دیکھا اور عزم کیا کہ وہ اپنے قلم کے ذریعے معاشرے خصوصاً خواتین تک اسلام کا پاکیزہ حیات بخش پیغام پہنچائیں گی۔ چنانچہ اپنے شوہر قاضی حمید اللہ کی وفات کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ادارہ عفت قائم کیا۔جس کے زیر اہتمام ایک ماہنامہ ''عفت'' کا اجراء ہوا۔بعدازاں ادارے کا نام بدل کر ''ادارہ بتول'' رکھ دیا گیا جس کی نگرانی میں ایک مقبول، بامقصد اور ادبی پرچہ ''بتول'' شائع ہونے لگا۔حمیدہ بیگم نے اپنی وفات تک ''بتول'' کے لیے نہایت مؤثر اور دلنشین انداز میں بہت کچھ لکھا۔آپ کا نصب العین ''ادب برائے نجات'' تھا۔جو کہ ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' کے برعکس حصولِ رجائے الٰہی سے مزین تھا۔اسی لیے آپ کی تحریریں ان عوامل پر مبنی ہیں جن کی بدولت قاری قنوطیت،خودستائی،حسد وعناد، بے رحمی، جذبۂ انتقام، بے عملی،شہوت پرستی،خودغرضی وخود پسندی، بزدلی،منافقت،بددیانتی،غرض ہر قسم کے اخلاقی عوارض سے احتراز کی جدوجہد کرنے لگتا ہے۔

جیلانی کامران نے اپنی ایک تحریر ''ادیب اور معاشرہ'' میں ادیب کے لیے خود شناسی ضروری قرار دیا ہے۔اسے معاشرے کا تہذیبی وجود ہونے کی وجہ سے اس پر ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ اس وجود کے مظاہر کا صورت گر بن کر رونما ہو۔وہ صورت گری کے خدوخال اور اسالیب کو اپنی تخلیقی آزادی کی وساطت سے خود دریافت کرے اور نئے مظاہر کا سراغ لگا کر ان کو آشکار کرے۔اس عمل کے نتیجہ میں ادیب ایک نئی اور بالاتر انفرادیت سے ہمکنار ہوگا۔اور اپنی بدلی ہوئی ذمہ داری اور تہذیبی وجود کے ساتھ اپنی رشتہ بندیوں سے الفاظ کی حرمتوں کو ایک جداگانہ مقام فراہم کرے گا۔ [۲]

حمیدہ بیگم نے بھی اپنے آپ کو معاشرے کا تہذیبی وجود سمجھتے ہوئے یہ ذمہ داری اُٹھائی کہ اس وجود کے مظاہر کی صورت گری کریں گی اور الفاظ کی حرمتوں کو ایک جداگانہ مقام عطا کریں گی۔ آپ کے مضامین اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان میں خواتین کو ان کے صحیح مقام سے آگاہ کیا گیا ہے۔ ان مضامین کا اسلوب سہل، برجستہ، شگفتہ اور پرتاثیر ہے۔ چھوٹے اور سادہ جملوں کے ذریعے مدعا بیان کیا گیا ہے۔ آپ کی ہر نگارش حکمت و بصیرت کا عمدہ مرقع ہے۔

پروفیسر فروغ احمد شاعر، ادیب، دانشور اور نقاد ہیں۔ آپ نے محترمہ حمیدہ بیگم کے طرزِ تحریر کا یہ پہلو نمایاں محسوس کیا کہ موصوفہ نے اپنی بات قارئین کے دلوں میں خوش اسلوبی سے اتارنے کے لیے کہانی کا پیرایۂ بیان بھی اختیار کیا۔ آپ کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ پڑھی لکھی اردو دان خواتین کو اپنی عائلی، معاشرتی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس دلایا جا سکے۔[۳]

علمی اور ادبی حلقوں میں جن خواتین نے مقبولیت حاصل کی ان کی صف میں حمیدہ بیگم کو شاید ایک غیر معروف شخصیت کا درجہ حاصل ہو لیکن ادب، مذہب اور معاشرہ کے لیے آپ کی مساعی کا عرصہ اتنا طویل ہے کہ بجا طور پر ایک منفرد ادیبہ اور محسنۂ ملک و ملت قرار دی جائیں۔ آپ نے مجلّہ ''بتـــول''، ہی کی ادارت کے فرائض تقریباً انیس سال تک سرانجام دیئے۔ اس کے علاوہ آپ کو ادبی میلان اور طبع موزوں رکھنے والی خواتین کی حوصلہ افزائی اور مناسب تربیت کا بہت خیال رہتا تھا۔ اس بات کا اعتراف کرنے والوں میں معروف ادیبہ، مصنفہ محترمہ نیر بانو، اور ممتاز ناول نگر سلمٰی یاسمین نجمی شامل ہیں۔ طوالت کے پیش نظر یہاں اس کا ذکر کرنا ممکن نہیں۔ تاہم معروف کہانی نویس ساحرہ ایم۔ اے کے درج ذیل الفاظ سے اس امر کی مناسب وضاحت ہو جائے گی۔

> ''میں چھوٹی موٹی کہانیاں تو کبھی کبھار لکھ لیتی تھی، مگر لکھنے کی طرف باقاعدہ توجہ آپا جی نے ہی دلائی۔ کہا کرتیں ''میں تمہارے ہاتھوں کو دیکھتی رہتی ہوں جو ایسا اچھا لکھتے ہیں۔ تمہاری آنکھوں کو دیکھتی ہوں جو ایسا باریک مشاہدہ کرتی ہیں۔ مجھے تمہارا لکھنا بہت پسند ہے۔ جس رسالے میں تمہارا مضمون ہو، میں اسے سب سے پہلے پڑھتی ہوں''۔ ان کی باتیں سننے کے بعد جب میں کوئی کہانی لکھنے لگتی تو مجھے یہی محسوس ہوتا کہ آپا حمیدہ اسے پڑھ رہی ہیں''۔[۴]

محترمہ حمیدہ بیگم کو لوگوں کی ذہنی و عملی استعداد کا اندازہ لگانے کا جو ملکہ حاصل تھا اس کو بروئے کار لا کر آپ نے ان گنت خواتین کی دینی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے تربیت فرمائی۔ انہیں حصولِ علم کی رغبت دلانے کی خاطر ''ربّ زدنی علما'' کا ورد بھی تلقین کرتیں اور یہ کہا کرتیں:

> ''کتابیں میرا اسلحہ ہے اور مطالعے کی وہی حیثیت ہے جو انجن میں پٹرول کی ہوتی ہے''۔[۵]

ایک مرتبہ محترمہ حمیدہ بیگم منڈی بہاؤالدین ایک تحریکی دورے پر گئیں۔ وہاں انفرادی ملاقاتوں کے لیے تانگہ کھڑا کر کے ایک گھر گئیں تو تانگے والے کو ''حقیقتِ اسلام'' مطالعہ کے لیے دے گئیں کہ ہمارے آنے تک اس کا

مطالعہ کرو۔[۶]

محترمہ حمیدہ بیگم ''بتول''کا اداریہ ''راہ ومنزل'' کے زیرِ عنوان لکھتی تھیں جس میں آپ نے زندگی کے ان تمام امور کی اصلاح کی خاطر قلم اٹھایا جو دیکھنے میں حقیر مگر اہمیت کے لحاظ سے بہت وقیع ہوتے۔عورت کی تعلیم اور ملازمت، بچوں کی تعلیم، تعطیلات میں ان کی مصروفیات، کھانے پینے کی معمولات، کھیلنے کے اوقات، افرادِ خانہ کے رویے وغیرہ۔ڈاکٹر عبدالغنی فاروق نے ان کی طرزِ تحریر کی تعریف یوں کی:

''ان کی تحریر ایک پرسکون ندی کی طرح خراماں خراماں چلتی اور دلوں میں اترتی جاتی۔ہلکی ہلکی لہریں اٹھتیں اور ذہنوں میں ہلچل مچا دیتیں''۔[۷]

محترمہ حمیدہ بیگم نے ابتداء میں کچھ افسانے اور کہانیاں بھی لکھیں مگر بعدازاں اپنی ساری توجہ ''راہ ومنزل''(اداریہ ''بتول'')پر مرکوز کر دی۔تاہم آپ کے مضامین میں کہیں کہیں آپ کی ذات کے اندر چھپے ہوئے کہانی نویس تلاش کیا جاسکتا ہے۔ملاحظہ کریں یہ عبارت جو حمیدہ بیگم نے اپنے مضمون ''ہر شخص کا مسئلہ'' کی تمہید کرتے ہوئے رقم کی:

''مجھے یہ تو بتاؤ کہ اس لاڈو کے چونچلے کون عمر بھر دیکھا کرے گا؟ اس نابکار نے تو میرا جینا حرام کر دیا ہے۔نہ یہ اپنی عمر کو دیکھتی ہے۔نہ تمہاری بساط کو، اسے تو کسی نواب کے گھر پیدا ہونا چاہیے تھا۔مجھ غریب کا تو اس نے کچومر نکال دیا۔میں بھلا اس کی ہر فرمائش کس طرح پورا کروں؟ آج کہتی ہے مجھے گانے سننے کی اجازت دو۔کل ضد کرے گی کہ ریڈیو سٹیشن جا کر خود گانے کی اجازت دو۔آخر میں کہاں تک ڈھیل دیتی جاؤں، کیا اسے عمر بھر گھٹنے کے ساتھ بٹھائے رکھوں گی؟ آخر اسے کسی کے گھر جانا ہے، اور کون ہوگا جو صرف اس کی صورت دیکھ دیکھ کر مطمئن رہے گا''۔[۸]

انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی میں اس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں نے جو طرح طرح کی صورتیں اختیار کی ہیں ان کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انسان نے برائی کو برائی کہنے اور اس سے بھی زیادہ برائی کا مداوا تلاش کرنے یا بعض غیر معمولی صورتوں میں اس کی بیخ کنی کو اپنا مستقل شعار بنایا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ برائی کی بیخ کنی کرنا اس کا علاج نہیں۔اصل علاج یہ ہے کہ برائی کی اصلاح کی جائے اور اس طرح کی جائے کہ برائی کرنے والا بری عادت کو برا سمجھنے کا عادی بنے اور کوشش کرے کہ آئندہ اپنے دامن کو اس غلطی یا گناہ کے داغ سے محفوظ رکھے۔جس منطق کے زیرِ اثر انسان نے برائی کو پہچان کر اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اسی منطق کا تقاضا ہے کہ وہ یہ سوچے کہ اصلاح کن طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔[۹]

سید وقار عظیم کے مذکورہ بالا اقتباس میں برائی کے حوالے سے اس اہم امر کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے کہ برائی کا استیصال ممکن نہیں تاہم اس کی اصلاح کے طریقوں کی دریافت ضروری ہے۔محترمہ حمیدہ بیگم نے بھی خرابی کو دور کرنے کے لیے ''صبر'' کو ایک مؤثر ذریعہ قرار دیا ہے اور اس کے پہلوؤں کی تدریجاً وضاحت کی ہے۔لکھتی ہیں:

''بچے ہوں یا بڑے، ان کی اصلاح کے سلسلے میں یاد رکھنا چاہئے کہ ''صبر'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس کے کئی پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ جلد بازی سے شدید اجتناب کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ دشواریوں، مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے میں استقامت دکھائی جائے۔ تیسرا یہ کہ کوششوں کا کوئی نتیجہ اگر جلد حاصل نہ ہو تو ہمت نہ ہاری جائے۔ چوتھے یہ کہ مقصد کی راہ میں بڑے سے بڑے خطرات، نقصانات، خوف اور طمع کے مواقع بھی اگر پیش آ جائیں تو قدم کو لغزش نہ ہونے پائے۔ اور پانچویں یہ کہ اشتعالِ جذبات کے سخت سے سخت مواقع پر بھی آدمی اپنے ذہن کا توازن نہ کھوئے۔ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نہ اُٹھائے۔ ہمیشہ سکون، صحت، عقل اور ٹھنڈی قوتِ فیصلہ کے ساتھ کام کرے۔ پھر خرابی جتنی زیادہ ہو اتنے ہی زیادہ صبر و ثبات سے کام لیا جائے اور ہر دم خدا کی مدد پر بھروسہ رکھا جائے۔''۱۰

عورت کے وجود سے تصویرِ کائنات میں رنگ بھی ہے اور روح بھی۔ لیکن لاتعداد انسانوں میں رہتے ہوئے بھی اس کے وجود اور کردار کی اہمیت کو کمتر سمجھا جاتا ہے۔ اور اسے بے توجہی، عدمِ تحفظ اور بے چارگی کی وادی میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ کشور ناہید نے مشہور فرانسیسی مصنفہ سیمون ڈی بووا کے حوالے سے عورت کی تنہائی کو اپنے مضمون ''عورت۔ سماجی زندگی میں'' تفصیلاً بیان کیا ہے۔ اس مضمون کا درج ذیل اقتباس قابلِ غور ہے:

''عورت اور مرد دونوں کو تنہائی کا آسیب یکساں تنگ کرتا ہے۔ مرد تو گھر سے باہر نکل کر نئے رشتوں اور دوستیوں کے تعاقب میں خود کو مصروف رکھ سکتا ہے، مگر۔۔۔۔۔ گھر میں رہنے والی خاتون نے ذہن کے استعمال کی تربیت حاصل نہیں کی ہے۔ وہ برتن دھونے سے کپڑے دھونے تک جسمانی طور پر مصروف رہتی ہے۔ مگر اس کا ذہن خلا میں ہیولے بناتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ وہ تنہائی کے گرداب میں سانس لے رہی ہوتی ہے۔ شادی کے فوراً بعد بھی یہ تنہائی جنم لے سکتی ہے کہ نندوں، دیوروں اور ساس کے بھرے پرے گھر میں شوہر تو یہی سمجھتا ہے کہ بیوی کا دل لگا ہوا ہے، مگر دراصل وہ اتنے ہجوم میں بالکل تنہا ہے''۔۱۱

حمیدہ بیگم نے بھی عورت کی تنہائی کو آزادیٔ نسواں کے تناظر میں دیکھا اور اس کی زبوں حالی کی وضاحت کچھ اس طرح کی ہے:

''کسی جگہ عورت کو بظاہر بڑی آزادی ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتی ہے، جہاں چاہے جا سکتی ہے لیکن اس کو مرد کی طرف سے جس تعاون کی ضرورت ہوتی ہے اس سے ایسی بے نیازی دکھائی جاتی ہے کہ وہ باوجود ایک شوہر کی بیوی ہونے کے اپنے تئیں بالکل تنہا محسوس کرتی ہے اور اسے بچوں کی تعلیم اور شادی بیاہ کی یوں اکیلے فکر کرنی پڑتی ہے جیسے اس کا کوئی مددگار نہ ہو۔ اور کسی جگہ عورت کی بظاہر بڑی قدر کی جاتی ہے، اس کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ ناچنا گانا اور کمانا کھانا سکھایا جاتا ہے لیکن

دراصل اس کو ایک ایسی مصیبت میں مبتلا کیا جاتا ہے جو چار دیواری کے اندر کیے جانے والے مظالم سے بازی لے جاتی ہے۔ اس کو ایک مرد نہیں کئی مردوں کی چاکری کرنی پڑتی ہے۔''

(بتول، جون ۱۹۵۸ء) ۱۲؎

شبانہ ریاض نے اپنے مضمون ''بیدی کے افسانوں میں عورت کے کردار'' میں اس امرِ واقع کی نشاندہی کی ہے کہ افسانہ نگاروں نے عورت کی خوبصورتی، حسن کے علاوہ اس کے مختلف روپ ماں، بہن، بیٹی، سوتیلی ماں، امیر عورت، غریب عورت، خادمہ، ماڈل گرلز وغیرہ کو اپنا موضوع تو بنایا مگر اس کی ذات کے کچھ اور پہلوؤں کی طرف ان کی توجہ بہت کم ہوئی۔ ان میں دکھ سہنے اور اپنے اندر کرب کو چھپا کر زندہ رہنے، وفا شعاری و سلیقہ مندی، اندر سے سسکتی اور اوپر سے مسکراتی گھریلو کام کاج میں مصروف، دوسروں کے زخموں پر مرہم رکھنے والی اور خاندان کو متحد رکھنے کی صلاحیت جیسے اوامر شامل ہیں۔ ۱۳؎

مسلم معاشرہ کے چند عناصر ایسے ہیں جن سے اس معاشرے کی تکوین بھی ہوتی ہے اور وہ افرادِ معاشرہ کو باہم مربوط بھی کرتے ہیں۔ ان میں سے نمایاں ترین عنصر وجودِ باری تعالیٰ کو بلا تردد تسلیم کرنا اور پھر اس کو اپنا رہبر بنانا ہے۔ محترمہ حمیدہ بیگم نے اس اہم امر کو کچھ اس طرح اجاگر کیا ہے:

''زندگی کو خوشگوار اور پر کیف بنانے والی چیز صرف اور صرف خدا کی یاد اور ہر حال میں اس کی رضا کے حصول کی جدوجہد ہے۔ یہ نہیں تو زندگی کی کوئی کل درست نہیں۔ آیئے لوگوں کو اس کی پرزور دعوت دیں کہ وہ جس کے بندے ہیں اپنے شعور کے ساتھ اسی کے بندے بن کر جئیں، وہ ان کو ہر راستے میں روشنی فراہم کرتا چلا جائے گا کہ رشتے داری، دوستی، ہمسائیگی کو نبھانے کے کیا سنہری اصول ہیں۔ آپ کمانے نکلیں گے تو وہ آپ کو بتائے گا کہ کون سی کمائی نفع بخش ہے اور کون سی نقصان دہ۔ اسی طرح خرچ کے معاملے میں وہ آپ کی رہنمائی کرے گا کہ کون سا خرچ بجا ہے اور کون سا خرچ فضول اور بے فائدہ۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی بتائے گا کہ آپس میں بات چیت کرنے اور ہنسنے بولنے کے کون سے قواعد و ضوابط ہیں''۔ ۱۴؎

اشفاق احمد نے اپنی مشہور تصنیف ''بابا صاحبا'' میں خدا سے رہنمائی لینے کی بابت ایک اہم طریقہ تجویز کیا ہے جو انہی کے الفاظ میں یہاں درج کیا گیا ہے:

''میں تم کو یہ بتانے آیا ہوں کہ جب تک تم اللہ سے نہیں پوچھو گے؛ بالکل سیدھے، بلا واسطہ طور پر۔ اس وقت تک تمہیں کچھ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور وہ تم سے کیا چاہتا ہے۔ جب ایک دفعہ اس کو سوال ڈال کر بیٹھ گئے تو پھر دل کے اندر جھانک کر ان ارتعاشوں کو دیکھو جو سوال کا جواب لاتے ہیں۔ لیکن اس عرصے میں اگر کوئی جواب موصول نہ ہو اور تمہارے سوال کا جواب خاموشی ہو تو پھر خوش ہو جاؤ کہ یہی جواب ہے اور اسی جواب کے لیے تمہیں سرگرمِ عمل رکھا گیا ہے''۔ ۱۵؎

اخلاقیات کے ماہرین نے عہد بہ عہد افرادِ معاشرہ کے تزکیۂ نفس اور کردار سازی کے لیے مختلف نظریات پیش کیے تاہم اسلام نے عفت و اخلاق کے تحفظ کے لیے نکاح کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ محترمہ حمیدہ نے بھی اس کی افاعیت کو اپنا موضوع بناتے ہوئے لکھا:

> ''اسلام نے سب سے زیادہ زور عفت و اخلاق پر دیا ہے اور اس کی خلاف ورزی کی جو سزا مقرر ہے وہ کسی دوسرے گناہ کی نہیں۔ اس لیے اس نے نکاح آسان سے آسان کر دیا ہے۔ اس میں نہ عمر کی کوئی قید ہے نہ مال و جائیداد کی، نہ ذات پات کی، نہ کسی اور چیز کی۔ پھر شادی کو کارِ ثواب اور اخلاق کی تکمیل کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ بلکہ یہاں تک کہا ہے کہ شادی کے بغیر تم وہ کام حسن و خوبی کر ہی نہیں سکتے جس کے لیے تم کو پیدا کیا گیا ہے''۔ بتول، مارچ ۱۹۶۵ء ۱۶؎

ڈاکٹر عابدہ علی نے مولانا مودودی کی نکاح سے متعلق نقطۂ نظر کو اس طرح نقل کیا ہے کہ یہ وہ تعلق ہے جو افراد کی زندگی میں سکون، استقلال اور ثبات پیدا کرتا ہے۔ یہی چیز ان کی انفرادیت کو اجتماعیت میں تبدیل کرتی ہے۔ اسی نظام کے دائرے میں محبت، امن اور ایثار کی وہ فضا پیدا کرتی ہے جس میں نئی نسلیں صحیح اخلاق، صحیح تربیت اور صحیح قسم کی تعمیرِ سیرت کے ساتھ پروان چڑھ سکتی ہے۔ ۱۷؎

ڈاکٹر عابدہ علی نے اسلامی نظریۂ حیات کے حوالے سے نکاح کی افادیت کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اسلام کے نزدیک نکاح ایسا باحرمت رشتہ ہے جو مرد و عورت دونوں کی مرضی سے پورے اعلان کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ نکاح کے بعد مرد اہل و عیال ہی جملہ ضروریات کا خیال رکھتا ہے اور اپنے تئیں اس ذمہ داری کے لیے جوابدہ سمجھتا ہے۔ بیوی گھر کا نظم و نسق چلاتی ہے اور اپنی عفت کو پوری طرح محفوظ رکھتی ہے۔ وہ نہایت محبت، ایثار، دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ خاندان کو تمدن کی وسیع خدمات سنبھالنے کے لیے تیار کرتی ہے۔ گویا نکاح ایک ادارہ ہے جس کے زیرِ تربیت اسلام اچھے انسان تیار کرنا چاہتا ہے اور اخلاقِ حسنہ کی ابتدائی تربیت اسی مقام پر دیتا ہے''۔ ۱۸؎

محترمہ حمیدہ بیگم کے خیال میں ''اسلام نے عورتوں کو اس قدر معاشی حقوق عطا کیے ہیں کہ کسی معاشرے میں آپ ان کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ آپ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

سب سے اول یہ کہ ان کو باپ، بیٹے اور شوہر کی جائیداد کا وارث قرار دیا گیا ہے۔

دوم یہ کہ کوئی شادی بغیر مہر کے نہیں، خواہ لاکھوں کروڑوں تک ہو جائے۔

سوم یہ کہ عورت کے پاس خواہ کتنا ہی زیادہ پیسہ ہو اس کے کھانے، کپڑے اور دوسری ضروریات کو پورا کرنے کا خرچ شوہر کے ذمہ رہتا ہے۔ شوہر نہ ہو تو باپ اور بھائی کے ذمے۔

چہارم یہ کہ عورت اگر کچھ کمائے تو مرد کا اس پر کوئی حق نہیں ہوتا کہ وہ اس کو خرچ کر سکے۔ لیکن مرد کی کمائی پر عورت کو پورا اختیار رہتا ہے کہ وہ مرد کی کمائی کے معیار کے مطابق خرچ کرے۔

پنجم یہ کہ اگر مرد طلاق دے دیتا ہے تو مرد کو کوئی حق نہیں رہتا کہ بیوی کو جو کچھ دے چکا ہے اس میں سے ایک پائی بھی واپس لے خواہ وہ کتنی زمینیں، جائیدادیں، روپیہ پیسہ یا زیور ہو''۔۱۹

مولانا محمد ظفیر الدین نے بھی محولہ بالاحقوق میں سے اس حق کی تصدیق کی ہے کہ بیوی خواہ باپ کے گھر سے کچھ بھی لائی ہو۔ بڑی سے بڑی جائیداد کی مالکہ بن کر ہی شوہر کے گھر کیوں نہ آئی ہو لیکن بیوی اور اولاد کے سارے مصارف کا قانوناً وشرعاً شوہر ہی ذمہ دار ہے۔۲۰

محترمہ حمیدہ بیگم کے اسلوب میں قاری کو سادگی، شائستگی اور جامعیت کی نمایاں خصوصیات سے واسطہ پڑتا ہے جن کی توضیح مظفر عباس نقوی نے اپنے الفاظ میں یوں کیا ہے:

''جو انشا پرداز اپنے موضوع کا واضح تصور رکھتا ہے اس کی عبارت میں خود بخود سادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سادگی شائستگی کی علامت ہے اور بجائے خود ایک ایسا حسن جس پر ہزار آرائشیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ وہ انشا پرداز جو ادب برائے ادب کے حامی ہیں اور عبارت آرائی کے لیے شعوری طور پر اہتمام کرتے ہیں ان کا اسلوب ابلاغ سے محروم ہا جاتا ہے۔ ابلاغِ خیال کے لیے ضروری ہے کہ انشا پرداز موقع و محل کی مناسبت سے موزوں ترین الفاظ کے انتخاب کا سلیقہ رکھتا ہو۔ انشا پرداز پر یہ اخلاقی فریضہ بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ قاری کے وقت کی قیمت کو محسوس کرے اور جہاں تک ممکن ہو کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ خیال ادا کرے۔ اسلوب کی اسی خصوصیت کو جامعیت کہتے ہیں''۔۲۱

محترمہ حمیدہ بیگم نے ابلاغ کو عبارت آرائی پر ترجیح دی ہے۔ قاری کے وقت کی قیمت کا احساس کرتے ہوئے مختصر الفاظ میں خیال پہنچا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ آپ نے نمود و نمائش سے اجتناب کی ترغیب کے لیے اس طرز کا استعمال کیا ہے۔ یہ تحریر ملاحظہ کیجئے

''گھروں کی بعض اخلاقی کھڑکیاں بہت فراخ ہوتی ہیں اور بعض بہت چھوٹی۔ ان سے نہایت محنت اور دھیان سے گزرنے کی عادت ہو جائے تو ہم اپنے سر کو سلامت پائیں گے۔ اصل میں سارا سلیقہ جو ہم تھوڑی دیر کے لیے غیروں کو دکھاتے ہیں، اپنے گھر میں دکھانے کی عادت ہو جائے تو آدھی سے زیادہ مشکلات حل ہو جائیں''۔۲۲

محترمہ حمیدہ بیگم علم و ادب کے میدان میں جہاں بلند پایہ مضامین اور اداریوں کی شکل میں نوجوان نسل کے لیے ایک گرانقدر سرمایہ چھوڑ گئیں، وہیں ایک ایسی متاثر کن شخصیت کا نمونہ بھی دے گئیں کہ بقول اقبال:

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز　　یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

محترمہ حمیدہ کی ذات خدا خوفی، خود احتسابی، توکل، انکسار، محبت فاتح عالم، ان تھک جدو جہد، صبر و حوصلہ مندی، اخلاص و دردمندی، استغنا، سادگی، انفاق فی سبیل اللہ، غربا کے ساتھ حسن سلوک اور بچوں سے محبت کا عملی

نمونہ تھی۔ جس کا نتیجہ آپ کی تحریروں کی اثر انگیزی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ایک مرتبہ فرمایا تھا:

> ''تحریر و تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں، اس کے اثر کو قبول کریں اور لطف اٹھائیں۔ اگر یہ نہیں تو تحریر و تقریر محض بیکار اور تضیع اوقات ہے''۔۲۳

بابائے اردو کی اس بات کا اطلاق جب حمیدہ بیگم کی تحریروں پر کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ آپ کا اسلوب سادہ اور سلیس ہونے کے باوجود اثر و لطف سے تہی نہیں ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ محترمہ حمیدہ بیگم نے قیام پاکستان کے بعد پاکستانی ادب میں اخلاق گریز رجحان کا مشاہدہ بھی کیا اور اس کی اصلاح کی تدابیر کیں۔ ان میں سے ایک یہ اقدام تھا کہ اپنے رسالے بتول کے لیے بھیجے جانیوالے فسانوں، کہانیوں اور مضامین کا ایک معیارِ اخلاق طے کر دیا کہ جس سے کم تر مواد کو شاملِ اشاعت نہیں کیا جائے گا۔ محترمہ کا موقف تھا کہ حقیقت سے بڑھ کر کوئی دلچسپی نہیں اور قارئین کو اخلاقی چیزیں پیش کرو، لوگ خود بخود کشش محسوس کریں گے۔

محترمہ حمیدہ نے خطوط، مراسلوں اور مضامین کی باقاعدہ مہم بھی شروع کی۔ آپ نے بچوں کے رسالہ 'ہدایت' کو چند خطوط لکھے تو سید نظر زیدی نے اس تنقید کو بنظرِ استحسان دیکھا اور تسلیم کیا کہ واقعی بچوں کو سنجیدہ اور بااخلاق ادب پڑھنے کو ملنا چاہیے۔ پھکڑ چیزیں ان کو پھکڑ بنا دیں گی۔ ایک روز نامے میں منٹو کے مضامین شائع ہو رہے تھے جن میں اداکاروں کے گفتنی ناگفتنی احوال ہوتے۔ اس موقع پر منور سلطانہ جو حمیدہ بیگم کی ہم خیال تھیں، اخبار کے مدیر علی سفیان آفاقی کی اس طرف توجہ مبذول کرائی تو انہوں نے اس معاملے کو سنجیدگی سے لیا۔ اور اخبار کو وہ سلسلۂ مضامین ختم کرنا پڑا۔ منٹو نے اس پر تنقید کی جو ان کی تصنیف ''گنجے فرشتے'' میں شامل ہے۔ محترمہ حمیدہ نے چلتے ہوئے دھارے کے خلاف رُخ موڑنے کا کام کیا جو پر صعوبت تھا۔ لیکن اپنی ہمت کو پست نہ ہونے دیا۔۲۴

حواشی:

۱۔ ندوی، اشفاق احمد، ڈاکٹر، جبران خلیل جبران، فن اور شخصیت، (لاہور: ریاض اکیڈمی، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۲۲۔۱۲۴

۲۔ جیلانی کامران، ادیب اور معاشرہ، مشمولہ راوی ۲۰۰۱ء، جی سی یونیورسٹی لاہور، جلد ۸۸، شمارہ اوّل، ص ۳۶

۳۔ عبدالغنی، فاروق، ڈاکٹر، اوصافِ حمیدہ، (لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۷

۴۔ ایضاً، ص ۱۴۶۔۱۴۷

۵۔ ایضاً، ص ۱۴۷

۶۔ ایضاً، ص ۱۴۹
۷۔ ایضاً، ص ۱۷۳
۸۔ ایضاً، ص ۱۹۸
۹۔ وقار عظیم، سید، فن اور فن کار، (لاہور: اردو مرکز، س ن)، ص ۶۰۔۶۱
۱۰۔ عبدالغنی، فاروق، ڈاکٹر، اوصافِ حمیدہ، ص ۲۴۰۔۲۴۱
۱۱۔ کشور ناہید، عورت مرد کا رشتہ، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص ۵۶۔۵۷
۱۲۔ عبدالغنی فاروق، ڈاکٹر، اوصافِ حمیدہ، ص ۱۸۸
۱۳۔ شبانہ ریاض، بیدی کے افسانوں میں عورت کا کردار، مشمولہ ''راوی'' ۲۰۱۲ء، شمارہ ۹۹، جی سی یونیورسٹی لاہور، ص ۸۰۔۸۱
۱۴۔ عبدالغنی فاروق، ڈاکٹر، اوصاف حمیدہ، ص ۲۵۸
۱۵۔ اشفاق احمد، بابا صاحبا، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز: ۲۰۰۹ء)، ص ۴۳۲
۱۶۔ عبدالغنی، فاروق، ڈاکٹر، اوصاف حمیدہ، ص ۲۳۵
۱۷۔ عابدہ علی، ڈاکٹر، عورت قرآن و سنت اور تاریخ کے آئینے میں، (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، س۔ن)، ص ۹۹۱، ص ۸۳۷
۱۸۔ ایضاً، ص ۹۱۱
۱۹۔ عبدالغنی، فاروق، ڈاکٹر، اوصاف حمیدہ، ص ۲۵۴
۲۰۔ ظفیر الدین، محمد، مولانا، اسلام کا نظام عفت و عصمت، (لاہور: مکتبہ نذیریہ، س۔ن)، ص ۵۶
۲۱۔ مظفر عباس نقوی، اسلوب اور اس کی تشکیل مضمون مشمول اردو نثر کا اسلوبیاتی مطالعہ (ملا وجہی سے سبطِ حسن تک)، مرتبہ ڈاکٹر عقیلہ جاوید، (لاہور: بیکن بکس، ۲۰۱۴ء)، ص ۳۵
۲۲۔ عبدالغنی، فاروق، ڈاکٹر، اوصاف حمیدہ، ص ۱۷۵
۲۳۔ وقار عظیم، سید، فن اور فن کار، (لاہور، اردو مرکز، س ن)، ص ۱۸۹
۲۴۔ عبدالغنی، فاروق، ڈاکٹر، اوصافِ حمیدہ، ص ۶۲۔۶۴

مآخذ:

۱۔ اشفاق احمد، بابا صاحبا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز: ۲۰۰۹ء۔
۲۔ ظفیر الدین، محمد، مولانا، اسلام کا نظام عفت و عصمت، لاہور: مکتبہ نذیریہ، س۔ن۔

۳۔ عابدہ علی، ڈاکٹر، عورت قرآن و سنت اور تاریخ کے آئینے میں ،لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، س۔ن۔

۴۔ عبدالغنی، فاروق، ڈاکٹر، اوصافِ حمیدہ، لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۴ء۔

۵۔ کشور ناہید، عورت مرد کا رشتہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء۔

۶۔ مظفر عباس نقوی، اسلوب اور اس کی تشکیل مضمون مشمول اُردو نثر کا اسلوبیاتی مطالعہ (ملا وجہی سے سبطِ حسن تک) ،مرتبہ ڈاکٹر عقیلہ جاوید، لاہور: بیکن بکس، ۲۰۱۴ء۔

۷۔ ندوی، اشفاق احمد، ڈاکٹر، جبران خلیل جبران، فن اور شخصیت، لاہور: ریاض اکیڈمی، ۱۹۹۴ء۔

۸۔ وقار عظیم، سید، فن اور فن کار، لاہور: اردو مرکز، س ن۔

☆☆☆